© rasailojaraid.com

مولانا عبدالرحمٰن کیلانی

ربا اور سُود

سود ایک جرم عظیم ہے۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں سے فرماتے ہیں کہ "اگر تم سود چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہو تو اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ"۔ اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ جنگ؟ مطلب واضح ہے کہ سود خوار مسلمان نہیں رہ سکتا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ سود اتنا بڑا گناہ ہے کہ "اگر اس کے ستر حصے کر دیے جائیں تو ان میں سے کم تر حصہ اپنی ماں سے زنا کرنے کے برابر ہے"۔ نیز فرمایا کہ "سود لینے والا، دینے والا، اس معاہدے کا لکھنے والا اور گواہ سب ایک جیسے مجرم ہیں"۔ یہ تصریح بھی فرما دی کہ "جس معاملے میں شک ہو اسے چھوڑ دیا جائے"۔ ان شدید احکام کے بعد ایک مسلمان کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ وہ سود اور اس کی تمام مشتبہ شکلوں سے پرہیز کرے۔

اتنے واضح اور سخت احکام کے باوجود مسلمانوں میں سے ایک طبقہ تجارتی سود کی اباحت کے لیے کئی طرح کے دلائل پیش کر رہا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ 'ربا' ایسے سود کا نام ہے جو کوئی مقروض اپنی بھوک اور احتیاج دُور کرنے کی غرض سے کسی مہاجن یا ساہوکار سے لیتا ہے اور سود خوار اس کی مجبوری سے ناجائز فائدہ اٹھا کر بھاری شرح سود پہ معاملہ کر کے اس پر ظلم کا مرتکب ہوتا ہے۔ عرب میں عہد نبویؐ میں اسی قسم کا سود رائج تھا۔ اسی شخصی احتیاج کے قرض پر سود کو 'ربا' کہا گیا، جسے قرآن کریم نے حرام قرار دیا ہے۔ رہا تجارتی سود، تو اس دَور میں قرضوں کا رواج ہی نہ تھا۔ عرب میں طوائف الملوکی، لوٹ مار، ڈاکا زنی کی وارداتیں عام ہوتی تھیں۔ وسائل سفر انتہائی محدود تھے۔ للٰہذا تجارت برائے نام ہوتی تھی۔ پھر اس تجارت میں تجارتی قرضوں کا وجود بھی ثابت نہیں ہوتا۔ اندریں حالات عصرِ حاضر کا کمرشل انٹرسٹ اس 'ربا' کی تعریف میں کیسے آ سکتا ہے۔ جسے قرآن کریم نے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حرام قرار دیا ہے؟

اس طبقے کے نزدیک مہاجنی قرضہ اور کمرشل انٹرسٹ میں امتیازی فرق درج ذیل ہے:

۱۔ مہاجنی قرضہ میں مقروض خود مہاجن کے پاس جا کر قرضہ کی درخواست کرتا ہے۔ جبکہ کمرشل انٹرسٹ کی صورت میں قرض دینے والا خود بنک کے پاس جا کر اپنی رقم پیش کرتا ہے کہ اسے کاروبار میں لگائے اور اسے بھی کچھ دے دے۔ بنک اس قرض دہندہ کو ایک پہلے سے طے شدہ شرح سود ادا کرتا ہے۔

صنعت کار یا تاجر جو بنک سے قرضہ حاصل کرنا چاہتا ہے، وہ بسا اوقات بنک کو خود شرح سود کی پیش کش کرتا ہے۔ بنک کے اس لین دین میں کسی فریق کی مجبوری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ سب کام باہمی رضامندی سے طے پاتے ہیں۔

۲۔ مہاجنی قرضہ میں شرح سود اتنی بلند ہوتی ہے کہ ایک ضرورت مند مفلس اس کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ جبکہ تجارتی سود پر تجارت میں نقصان کے احتمال کو سامنے رکھ کر مناسب شرح سود مقرر کی جاتی ہے جو نقصان کی صورت میں بھی قابلِ برداشت ہوتی ہے۔ لہٰذا کمرشل انٹرسٹ میں مقروض پر کچھ ظلم نہیں ہوتا۔

۳۔ مہاجنی قرضے کی صورت میں مہاجن کو بعض دفعہ سود تو بجائے خود رہا، اصل بھی وصول نہیں ہوتا۔ جبکہ بنک انٹرسٹ میں بنک اپنے مفادات کا پورا تحفظ کر لیتا ہے۔ بنک زیورات جنس، خام مال یا دیگر اشیا بطور زرِ رہن رکھ کر اس کا ساٹھ فیصد تک قرضہ دیتا ہے۔ لہٰذا بنک کو نقصان کا خطرہ نہیں ہوتا۔ رہے نادار لوگ تو بنک انھیں قرضہ دینے سے یکسر انکار کر دیتا ہے۔

۴۔ مہاجنی قرضہ میں نقصان کا پہلو نفع کی نسبت زیادہ ہے کیونکہ اس میں ایک نادار پر ظلم ہوتا ہے۔ جبکہ کمرشل انٹرسٹ میں ہر ایک کے لیے فائدہ ہے اور نقصان کا احتمال بہت کم رہ جاتا ہے۔ لہٰذا قرآن کریم کے اس اصول و اثمهما اکبر من نفعهما (شراب اور جوئے سے متعلق) کے مطابق بھی بنک انٹرسٹ کو اس ربا سے مستثنیٰ قرار دیا جانا چاہیے جسے حرام قرار دیا گیا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

موجودہ دور میں ساری ملکی و غیر ملکی تجارت کا انحصار سُود پہ ہے۔ لہٰذا عصرِ حاضر کا تقاضا یہ ہے کہ مندرجہ بالا وجوہات کے پیشِ نظر ربا کی تعریف میں اجتہاد کر کے مناسب ترمیم کی جانی چاہیے تاکہ اسلام ہر زمانے کے تقاضوں کا ساتھ دینے والا نظام ثابت ہو سکے۔

مذکورہ بالا دلائل میں درج ذیل امور تنقیح طلب ہیں:

۱۔ کیا عہدِ نبوی میں عرب میں فی الواقع تجارت نہایت محدود تھی۔؟

۲۔ کیا اس عہد میں تجارتی قرضوں کا رواج تھا؟

۳۔ کیا شرح سود کی کمی یا مناسب شرح حرمتِ سود پہ اثر انداز ہو سکتی ہے؟

۴۔ فریقین کی رضامندی سود کو جائز بنا سکتی ہے۔؟

۵۔ کیا حرمتِ سود کی علت 'ظلم' ہے؟ اگر فریقین میں سے کسی پر ظلم کا احتمال نہ ہو تو سود کو جائز قرار دیا جا سکتا ہے؟

۶۔ عصرِ حاضر کے تقاضوں کے تحت سود کی تعریف میں اجتہاد کیا جا سکتا ہے جبکہ اس کا نفع نقصان سے زیادہ ہے؟

ہم ان تنقیحات پر علی الترتیب کلام کریں گے:

۱۔ عہدِ نبوی میں تجارت

عرب ایک بے آب و گیاہ ملک ہے۔ بہت تھوڑا رقبہ قابلِ کاشت ہے۔ اس پر بھی بہت کم توجہ دی جاتی تھی۔ کیونکہ شرفائے عرب زراعت کو ایک حقیر پیشہ تصور کرتے تھے اسی طرح ہاتھ سے کام کرنے یا دست کاری کے کام کو بھی عار سمجھتے تھے۔ عرب میں عام لوگوں کا پیشہ تو بھیڑ بکریاں، گائے اور اونٹ پالنا تھا۔ شرفائے عرب کا محبوب شغلہ تجارت تھا۔ البتہ یمن میں اون کاتنے، چادریں اور کمبل بُننے کا کام بھی ہوتا تھا۔ عربوں کو چونکہ فنونِ سپہ گری سے خاص دلچسپی تھی، لہٰذا کہیں کہیں آلاتِ جنگ بھی تیار کیے جاتے تھے۔

نتیجۃً اہلِ عرب کو اشیائے خورد و نوش اور دیگر ضروریات کا سامان باہر سے درآمد کرنا پڑتا تھا۔ بلاشبہ ان دنوں لوٹ مار اور ڈاکہ زنی کا دور دورہ تھا اور اکّا دکّا مسافر کا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جان و مال محفوظ نہ تھا۔ مگر یہ تجارت عموماً قافلوں کی شکل میں ہوتی تھی۔ قریش مکہ کا تو پاسبانِ حرم ہونے کی وجہ سے بھی احترام کیا جاتا تھا۔ دوسرے قافلے یا تو قریش مکہ کے اثر سے فائدہ اٹھاتے یا اپنی حفاظت کا سامان ساتھ لے کر چلتے تھے۔ غیر ملکی قافلوں کو بحفاظت گزارنے کے عوض ان سے ٹیکس بھی لیا جاتا تھا۔

اندرونی تجارت کے بڑے حصے پر قریش مکہ چھائے ہوئے تھے۔ ان کے تجارتی قافلے گرمیوں میں شام کا رخ کرتے اور سردیوں میں یمن کا جو گرم ملک ہے، ان قافلوں کا ذکر قرآن کریم میں بھی موجود ہے۔ مکہ میں ہر طبقے کے لوگ اپنا فروختنی سامان اس قافلے کے حوالے کر دیتے، جسے وہ اچھے داموں بیچ کر ادھر سے سامان خرید لاتے تھے۔ اس طرح دوہری تجارت سے انھیں دُگنا منافع حاصل ہوتا، جو بعض دفعہ ۵۰ فیصد تک پہنچ جاتا تھا۔ اہلِ مکہ کی خوشحالی کا دارومدار اس قافلے کی کامیابی پر منحصر ہوتا تھا۔ حضور اکرمؐ نے خود بھی بعثت سے پہلے مدینہ، بصرہ اور شام کے متعدد تجارتی سفر کیے تھے۔

یہ قافلے کتنے بڑے ہوتے تھے؟ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ابوسفیان کا وہ قافلہ تجارت۔ جو جنگِ بدر کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ دو ہزار باربردار اونٹوں پر مشتمل تھا۔ کئی مورخوں نے اندازہ لگایا ہے کہ یہ درآمد برآمد کی کل تجارت ۵۰ لاکھ دینار سالانہ تک ہوتی تھی۔ دینار سونے کا سکہ تھا، جس کی قیمت موجودہ حساب سے تقریباً ۶۰ روپے ہے۔ گویا یہ تجارت ۳۰ کروڑ روپے سالانہ تک جا پہنچتی تھی۔

یہ تجارتی قافلے صرف قریش مکہ پر ہی محدود نہ تھے۔ یمنی تاجر مکہ و مدینہ کے راستے شام تک جاتے تھے۔ مدینہ کے یہودی جو ایک سرمایہ دار قوم تھی، شام سے گندم اور شراب درآمد کرتے تھے۔ علاوہ ازیں غیر ملکی تاجروں کی آمدورفت بھی رہتی تھی۔ ملک میں کئی جگہ بازار و منڈیاں لگتیں جہاں لوگ خرید و فروخت کے لیے جمع ہوتے تھے۔ سوداگروں کے قافلے ایران اور عراق سے تجارتی سامان لے کر یہاں آتے اور یہاں کی اشیا اپنے ممالک میں لے جاتے۔ اس طرح یمن سے بحر ہند کے راستے ہندوستان، عراق کے راستے مشرقی ممالک اور شام و مصر کے راستے افریقہ سے تجارت ہوتی تھی۔ گویا عرب مشرق و مغرب میں بین الاقوامی منڈی بن گیا تھا جس میں شہر مکہ کو مرکزی حیثیت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حاصل تھی۔

احادیث میں تجارت کی جن انواع و اقسام کا ذکر آتا ہے، ان سے بیشتر آج بھی رائج ہیں۔ ان سے بھی پتا چلتا ہے کہ ان ایام میں عرب میں تجارت کا کاروبار عروج پر تھا۔ متعدد صحابہ کرام تجارت ہی کی وجہ سے لکھ پتی بن گئے تھے، نیز تجارت کے سلسلے میں مسلمانوں کو جو ہدایات دی گئی ہیں، وہ آج بھی مشعلِ راہ کا کام دیتی ہیں۔

اندریں حالات یہ مفروضہ — کہ عہد نبوی میں تجارت نہایت پُرخطر تھی لہٰذا برائے نام رہ گئی تھی — بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے، جس کی تاریخ تائید نہیں کرتی۔

تجارتی قرضے اور سود

اسلام نے تجارتی اور شخصی قرضوں کے سود میں کوئی فرق روا نہیں رکھا۔ اگر ایسی بات ہوتی تو ضرور اس کی وضاحت کر دی جاتی۔ اس کی نگاہ میں اصل سے ایک مقررہ شرح کے مطابق جو کچھ بھی زیادہ لیا جائے اور جس طرح بھی لیا جائے وہ 'ربا' ہی ہے۔ ربا کے لغوی معنی بھی اس مخصوص اضافہ کے ہیں جو اصل سے زائد لیا جاتا ہے۔ اور شخصی اور تجارتی قرضوں کے سود میں فرق کرنا گویا:

أَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ (۲ : ۸۵)

کیا تم کتاب کے کچھ حصے پر تو ایمان لاتے ہو اور کچھ کا انکار کر دیتے ہو۔

کے مترادف ہے۔ ربا اور سود کا الگ الگ مفہوم مقرر کرنا موجودہ دور کی اختراع ہے جس کا مسلمانوں کی طویل تاریخ میں کہیں سراغ نہیں ملتا۔

عہدِ نبوی ﷺ میں تجارتی قرضوں پر بھی سود لینے کا رواج موجود تھا جس کا ذکر تفاسیر میں موجود ہے۔ صاحب تفسیر خازن آیت وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوا کے تحت لکھتے ہیں:

حضرت عباس اور خالد بن ولید نے زمانہ جاہلیت میں شراکت کی تھی اور سودی کاروبار کرتے تھے۔ وہ قبیلہ بنو عمیر (جو قبیلہ ثقیف۔ طائف سے تعلق رکھتا تھا) کے لوگوں کو کاروبار کے لیے سودی قرض دیتے تھے۔ جب اسلام آیا تو ان کی بہت بڑی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

رقم واجب الوصول تھی جو انھوں نے چھوڑ دی۔[1]

جلیل القدر مفسّر علامہ ابن جریر طبری متوفی (۳۱۰ھ) اس آیت کی تفسیر میں یوں رقم طراز ہیں:

كَانَ رِبًا يَتَبَايَعُوْنَ فِي الْجَاهِلِيَّةِ۔

یہ وہ سود تھا جس کے ساتھ جاہلیت میں لوگ خرید و فروخت کرتے تھے۔

حضورِ اکرمؐ کے بالکل قریب کے زمانے میں قیصرِ روم جسٹینین نے (جس کی وفات حضور اکرمؐ کی پیدائش سے صرف پانچ سال قبل ہوئی تھی) تمام بازنطینی سلطنت میں از روئے قانون زمینداروں اور کاشتکاروں کے قرضوں پہ ۴ فیصد، تجارتی اور صنعتی قرضوں پہ ۸ فیصد اور بحری تجارت کے قرضوں پہ ۱۲ فیصد شرحِ سود مقرر کی تھی۔ یہ قانون جسٹینین کے بعد بھی ایک مدت تک بازنطینی سلطنت میں رائج رہا۔[2]

روم کی سلطنت عرب کی ہمسایہ مملکت تھی جس کا ذکر قرآن کریم میں بھی آیا ہے۔ یہاں تجارتی سود اپنی تمام شکلوں میں رائج تھا۔ اسی طرح دیگر ممالک میں تجارتی سود کے شواہد مل جاتے ہیں جو بغرضِ طوالت چھوڑ دیے جاتے ہیں۔ یہ ہم پہلے بتلا چکے ہیں کہ آس پاس کے ملکوں سے اہلِ عرب کے گہرے تجارتی روابط اور میل جول تھا۔ اندریں حالات یہ تصور کرنا ناممکن ہے کہ اہلِ عرب تجارتی سود سے ناواقف ہوں۔ اگر ہم صاحبانِ سود کے خیال کے مطابق یہ فرض کر لیں کہ عرب میں سرمایہ تجارتی سود کے ذریعہ فراہم نہیں کیا جاتا تھا تو بھی اس سے تجارتی سود کی اباحت کے متعلق کوئی گنجائش نہیں نکل سکتی۔ ایک طرف تو ہم یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اسلام کے احکام ابدی اور تمام دنیا کے لیے ہیں۔ دوسری طرف ہم صرف عرب کے ایک مخصوص دور پر نظر رکھ کر سود کے احکام کو صرف اس دور تک محدود رکھنا چاہتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا (معاذ اللہ!) اللہ تعالیٰ کو اتنا علم بھی نہ تھا کہ ہمسایہ ملک میں کس طرح کا سود رائج ہے۔

---

[1] تفسیر خازن ج ۱ ص ۲۰۳ بحوالہ اسلام اور سود از انور اقبال قریشی ص ۱۱۲

[2] سود از مودودی صاحب ص ۲۸۷ بحوالہ A Story of Civilisation از ول ڈیورانٹ ج ۴ ص ۱۲۰، ۴۳۶ (۲) زوال و سقوط دولتِ روم از گبن ج ۲ ص ۱۶

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یا آئندہ کیا کچھ ہونے والا ہے؟ کیا یہی کچھ علم و حکمتِ خداوندی ہے؟ سود کے یہ بالاطلاق خدائی احکام اور حضور اکرمؐ کا سود کی مشتبہ شکلوں سے بھی پرہیز کو لازم قرار دینا اس بات کی واضح دلیل ہے کہ سود کی کوئی بھی شکل کسی بھی دور میں حلال قرار نہیں دی جاسکتی۔

تجارتی سود کے متعلق الگ احکام بالغت کی ضرورت اس لیے پیش نہ آئی کہ اسلام ایسے قرضوں کی الگ نوعیت کو تسلیم نہیں کرتا۔ سود کے احکام ہر قسم کے قرضوں پر منطبق ہوتے ہیں۔ ان احکامات میں جہاں شخصی حاجات کے سود کی حرمت کا پتا چلتا ہے وہاں تجارتی سود کی حرمت پر بھی واضح ارشادات موجود ہیں۔ مثلاً:

۱۔ خدا تعالیٰ فرماتے ہیں:

وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَیْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا۔ (۲: ۲۷۵)

اللہ تعالیٰ نے تجارت کو حلال اور سود کو حرام قرار دیا ہے۔

یہاں خرید و فروخت یا تجارت کے مقابلے میں لفظ ربا کا استعمال تجارتی سود کی طرف واضح اشارہ ہے۔ جہاں شخصی حاجات کے قرضوں کا ذکر مقصود تھا وہاں قرآن کریم نے ربا کے مقابلے میں صدقہ کا لفظ استعمال فرمایا ہے:

یَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَیُرْبِی الصَّدَقٰتِ۔

اللہ تعالیٰ سود کو ختم کرتا اور صدقات کی پرورش کرتا ہے

۲۔ قرآن کریم کے اس ارشاد:

وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ۔ (۲: ۲۷۹)

پھر اگر تم توبہ کر لو، تو تمہارے لیے تمہارے راس المال ہیں۔

اس میں بھی تجارتی قرضوں کی طرف واضح اشارہ ہے۔ کیونکہ راس المال یا سرمایہ کا اطلاق عموماً تجارت پر لگائی ہوئی رقم کے لیے ہوتا ہے۔

۳۔ قرض کے لیے عربی میں دو لغت ہیں۔ قرض اور دَین۔ قرض کا مفہوم عام فہم ہے اور عموماً شخصی قرضوں کے لیے آتا ہے۔ ارشادِ نبوی ہے۔

اِذَا اَقْرَضَ اَحَدُكُمْ الرَّجُلَ فَلَا يَاخُذْ هَدِيَّةً۔ (بخاری)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جب کوئی شخص کسی دوسرے آدمی کو قرض دے تو پھر اس سے ہدیہ قبول نہ کرے۔
جبکہ دَین کا لفظ ہر قسم کے لین دین پر محیط ہے۔ اس کا صحیح ترجمہ ذمہ داری یا انگریزی میں Liability ہوگا جس میں کاروباری قرضے بھی شامل ہوتے ہیں۔ ارشاد باری ہے:
یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَدَایَنْتُمْ بِدَیْنٍ اِلٰٓی اَجَلٍ مُّسَمًّی فَاكْتُبُوْهُ (۲: ۲۸۲)
اے ایمان والو! جب تم آپس میں ایک مقررہ وقت کے لیے ادھار کا لین دین کرو تو اسے لکھ لیا کرو۔
اور ربا کی تعریف "الزِّیَادَةُ فِی الدَّیْن" سے کی جاتی ہے نہ کہ "الزیادہ فی القرض" سے۔
لہٰذا ان وجوہات کی بنا پر تجارتی قرضوں کو "ربا" سے خارج کرنے کی گنجائش نظر نہیں آتی۔

۴۔ شرح سود میں کمی

تجارتی سود کی حمایت میں یہ دلیل کہ اس کی شرح نقصان کے احتمال کو مدنظر رکھ کر مناسب اور قابلِ برداشت مقرر کی جاتی ہے، کئی لحاظ سے محلِ نظر ہے:

اولاً یہ کہ مناسب شرح سود کا آج تک تعین نہیں ہو سکا کبھی تو ۲½ فیصد شرح بھی مناسب سمجھ لی جاتی ہے اور کبھی ۲۰ فیصد شرح بھی نامناسب ہوتی ہے۔ شرح سود کی مناسب تعیین نہ ہو سکنے کی غالباً یہ وجہ ہے کہ اس کی بنیاد ہی متزلزل اور کمزور ہے۔ اس اہم مسئلے پر۔ کہ سود آخر کس چیز کا معاوضہ ہے؟۔ معیشت دانوں میں جتنے اختلافات پائے جاتے ہیں شاید ہی علمِ معیشت کے کسی دوسرے مسئلے میں پائے جاتے ہوں۔

ثانیاً یہ کہ آج کل پاکستان کے سٹیٹ بنک نے عام بنکوں کو قرض دینے کی شرح ۱۰ فیصد مقرر کر رکھی ہے۔ اب عام بنک کاروباری حضرات کو ۱۴ فیصد شرح پہ قرض دیتے ہیں۔ جو سود در سود کے چکر سے ۱۷ فیصد تک اور بعض صورتوں میں اس سے زیادہ بن جاتی ہے۔ یہ مناسب شرح سود ہے۔ پھر حکومت خود عوام سے کاروبار کے لیے جو قرضے لیتی ہے تو یہ شرح دس سال کے قرض کے لیے ۲۹ فیصد ہے اور رقم دس سال میں بجا رگنا ہو جاتی ہے۔ (اشتہار افسر سٹلمنٹ بنک نوائے وقت ۷۷-۸-۱۱) تو یہ بھی مناسب شرح سود ہے۔ اب آپ خود اندازہ کیجیے کہ اگر یہ سب کچھ مناسب شرح ہے تو نامناسب کیا ہو سکتی ہے؟ اور اگر ایسے قرض لے کر تجارت کی جائے جہاں نقصان کے احتمال

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بھی موجود ہیں تو گرانی اشیا کا کیا عالم ہو گا ؟

ثالثاً : یہ کہ شرح سود کی کمی بیشی حرمتِ سود پہ اثر انداز نہیں ہو سکتی - شرح سود ایک فی صد ہو یا ۵۰ فی صد شریعت کی نگاہ میں ایک جیسا جرم ہے - شراب کا ایک قطرہ بھی ویسے ہی حرام ہے جیسے ایک چھلکتا جام - کیونکہ شریعت کا یہ مسلمہ اصول ہے کہ حرام چیز کی قلیل ترین مقدار بھی ویسے ہی حرام ہے جیسے اس کی کثیر مقدار -

۴ - فریقین کی رضا مندی

فریقین میں رضا مندی کی شرط حلال چیزوں میں ہوا کرتی ہے جیسے تجارت یا نکاح وغیرہ - حرام چیزوں میں فریقین کی رضا مندی کی شرط قطعاً غلط اور باطل ہے - فریقین کی رضا مندی زنا یا جوئے کو جائز نہیں بنا سکتی - پھر آخر سود جیسی مکروہ چیز کو لوگوں کی مرضی پر کیسے چھوڑا جا سکتا ہے - علیٰ ہذا القیاس سود لینے والا شرائط پیش کرے یا دینے والا اس سے سود کی حرمت میں کوئی فرق نہیں پڑ سکتا -

یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ سود دینے والا کبھی سود دینے پر رضا مند نہیں ہوا کرتا اگر اسے کم شرح سود پہ قرضہ مہیا ہو سکے یا کہیں سے قرض حسنہ ملنے کی توقع ہو تو وہ کبھی بہ سودی قرض لینے پر تیار نہ ہو گا -

۵ - ربا اور ظلم

تجارتی سود کی حمایت میں یہ دلیل بڑے شد و مد سے پیش کی جاتی ہے کہ اس میں کسی فریق پر ظلم نہیں ہوتا - اور قرآن کریم کے الفاظ لا تظلمون ولا تظلمون کو بطور علتِ حرمت پیش کیا جاتا ہے حالانکہ ظلم سود کی حرمت کا بنیادی سبب نہیں ہے - آیت کے سیاق و سباق سے واضح ہے کہ یہ الفاظ سودی معاملات اور معاہدات کو ختم کرنے کی ایک احسن صورت پیش کرتے ہیں یعنی نہ تو مقروض قرض خواہ کی اصل رقم بھی دبا کر اس پر ظلم کرے اور نہ قرض خواہ مقروض کی مجبوری سے فائدہ اٹھا کر اصل کے علاوہ مزید کچھ مطالبہ کرے - ان الفاظ کا اطلاق ہمارے ہاں اس وقت ہو گا جب ہم معاشرے سے سود کو ختم کر دیں گے -

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سود کی حرمت کی بنیاد ظلم نہیں بلکہ مال میں اضافہ کی وہ ہوس ہے جس سے ایک سرمایہ دار اپنی فاضل دولت میں طے شدہ منافع کی ضمانت سے مزید اضافہ چاہتا ہے۔ سود کے متعلق سب سے پہلی آیت جو مکی دور میں نازل ہوئی اس میں اس بنیادی وجہ کی وضاحت کر دی گئی ہے۔ ارشاد ہے:

وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّيَرْبُوَا۟ فِيْٓ اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا يَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰهِ ۔ (۳۰ : ۳۹)

اور جو رقم تم سود پہ دیتے ہو تاکہ وہ لوگوں کے مال سے بڑھے تو یہ مال اللہ کے ہاں نہیں بڑھتا۔

سرمایہ دار جب اپنی فاضل رقم سود کی راہ میں ڈال دیتا ہے تو وہ رقم لوگوں کے گھروں میں پہنچ پہنچ کر ان کی دولت بھی سرمایہ دار کے ہاں پہنچا دیتی ہے۔ یہی ناہمواری دولت تقسیم سود کی حرمت کا بنیادی سبب ہے۔ اس آیت میں یہ اشارہ بھی ملتا ہے کہ یہ چیز بالآخر معاشرے میں بگاڑ اور تباہی کا باعث بنے گی۔

اب ہم یہ فرض کر لیتے ہیں کہ حرمتِ سود کی علت ظلم ہے۔ تجارتی سود میں مقروض اور قرض خواہ کسی پر بھی ظلم نہیں ہوتا۔ لیکن اصل مظلوم تو معاشرہ ہے جو تجارتی قرضوں کی وجہ سے پیدا ہونے والی گرانی کی چکی میں پستا ہے۔ معاشرے میں اس ظلم کی ذمہ داری کس پہ ہوگی، قرض خواہ پہ یا مقروض پہ؟

ربا میں نفع و نقصان کا تقابل

ایسے شرعی احکام میں، جو نص قطعی سے ثابت ہوں نفع و نقصان کا تقابل کرنا، ایک مسلمان کا شیوہ نہیں، کیونکہ انسانی عقل کسی چیز کے نفع و نقصان کا مکمل احاطہ نہیں کر سکتی۔ انسانی عقل کا یہ عالم ہے کہ وہ اپنے ذاتی مفاد کا بھی پوری طرح اندازہ نہیں لگا سکتی۔ وراثت کے احکام بیان کرتے ہوئے خدا تعالیٰ فرماتے ہیں۔

اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ لَا تَدْرُوْنَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا ؕ (۴ : ۱۱)

تمہارے باپ ہوں یا بیٹے تمہیں خبر نہیں کہ کون ان سے نفع کے لحاظ سے تمہارے قریب تر ہے۔

آپ ایک شرابی سے شراب کے نفع و نقصان کے متعلق پوچھیے تو وہ اس کے فوائد ہی زیادہ بتلائے گا، شاید ہی کسی ایک ادھ نقصان کی طرف اشارہ کرے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ایک سینما کے رسیا سے سینما کے متعلق پوچھ دیکھیے تو شاید وہ اس کے نقصانات کا ذکر تک بھی گوارا نہ کرے۔ اسی طرح سود کے حامی یا سود خوار سود کے فوائد تو بہت بتلا سکتے ہیں لیکن نقصانات انھیں نظر نہیں آتے۔ تو کیا کسی کو یہ حق دیا جا سکتا ہے کہ جو کسی چیز میں نقصان سے فائدہ زیادہ ثابت کر سکے وہ شرعی احکام میں اجتہاد اور ترمیم کی سفارش کر دے۔

شراب اور جوئے کے متعلق قرآن کریم میں نفع و نقصان کا جو تقابل کیا گیا ہے وہ اللہ تعالیٰ نے خود کیا ہے۔ اسے شرابیوں اور جواریوں کے فیصلے پر نہیں چھوڑا۔ پھر سود کے حامیوں کو اس تقابل کا حق کیونکر دیا جا سکتا ہے؟

کہا جاتا ہے کہ "شراب کی حرمت کی بنیاد اس کا نشہ آور ہونا ہے۔ لیکن اس کے باوجود فقہا نے ہر نشہ آور چیز کو حرام قرار نہیں دیا بلکہ صرف ان نشہ آور چیزوں کو حرام قرار دیا ہے جن کا ضرر واقعی نفع سے زیادہ ہو۔"

بات سیدھی سی تھی لیکن اس میں خواہ مخواہ الجھاؤ پیدا کر دیا گیا ہے۔ شریعت نے ہر نشہ آور چیز کو حرام قرار دیا ہے۔ ارشاد نبوی ہے: کُلُّ مُسْکِرٍ حَرَامٌ۔ اور مسکر ایسے نشے کو کہتے ہیں جو ایک عام آدمی کے حواس پر اثر انداز ہو کر انھیں مختل کر دے، جو چیزیں ایسا اثر پیدا نہیں کرتیں وہ مسکر یا نشہ آور نہیں ہیں۔ لہٰذا وہ حرام بھی نہیں ہیں۔ اس میں نفع و نقصان کے تقابل کا سوال کہاں پیدا ہوتا ہے۔

ربا کی تعریف میں اجتہاد

مذکورہ بالا دلائل کی بنا پر ربا کی تعریف میں اجتہاد کی جو سفارش کی جاتی ہے ہم اس سے معذرت ہی چاہیں گے۔ اجتہاد کی ضرورت اس وقت پیش آتی ہے جبکہ اوامر کے نفاذ میں کوئی مجبوری درپیش ہو جس کا کوئی متبادل حل نظر نہ آتا ہو۔ یا اس سے کسی بگاڑ کا خطرہ پیدا ہو جائے۔ لیکن سود کے معاملے میں ایسی کوئی صورت موجود نہیں ہے۔ سود خوار کو کوئی ایسی مجبوری نہیں کہ وہ سود پر قرض دے۔ تجارتی قرضوں کا بھی شریعت نے متبادل حل پیش کر دیا ہے، اور شخصی حاجات کے قرضوں کا بھی۔ ملکی یا غیر ملکی تجارت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں کوئی مجبوری نہیں ہے اور اگر ہے بھی تو ہم اس کے مکلف نہیں ہیں۔ پھر آخر کس بنا پر ایک قطعی حرام چیز میں اباحت کی راہیں تلاش کی جائیں۔ اور اگر ایسا کیا جائے تو یہ اجتہاد نہیں بلکہ دین میں تحریف ہوگی جو اسلامی معیشت کی روح کو ناقابل تلافی نقصان پہنچانے کے مترادف ہوگی۔

ہمارے دوست جب اجتہاد کا ذکر کرتے ہیں تو حضرت عمرؓ کے گیارہ سالہ دورِ حکومت کے کئی واقعات بطور شہادت پیش کر دیتے ہیں۔ ہم بھی تسلیم کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ فی الواقع ایک عظیم مفکر، بہت بڑے سیاست دان، صاحبِ بصیرت اور اسلام کے انتہائی دلدادہ تھے۔ حالات کے تقاضوں کے مطابق اجتہاد یا قانون میں لچک پیدا کر لیتے تھے۔ ہمیں حیرت تو اس بات پر ہے کہ حضرت عمرؓ نے گیارہ سالہ تحقیق اور حالات کے تقاضوں کو مدنظر رکھ کر سود کے متعلق جو فتویٰ صادر فرمایا تھا وہ ان دوستوں کے لیے کیوں قابلِ قبول نہیں ہے؟ آپ نے فرمایا تھا:

اِنَّ اٰيَةَ الرِّبٰو مِنْ اٰخِرِ مَا اُنْزِلَ مِنَ الْقُرْاٰنِ وَاِنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عليه وسلم قُبِضَ اَنْ يُّبَيِّنَهُ لَنَا فَدَعُوا الرِّبٰوا وَالرِّيْبَةَ۔

آیتِ ربا قرآن کی ان آیات سے ہے جو آخر زمانہ میں نازل ہوئیں اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہوگیا پیشتر اس کے کہ تمام احکام ہم واضح فرماتے۔ لہٰذا تم لوگ سود کو بھی اور ہر اس چیز کو بھی چھوڑ دو جس میں سود کا شائبہ ہو۔

غور فرمائیے! اگر تجارتی سود میں اجتہاد کی گنجائش کچھ بھی ہوتی تو حضرت عمرؓ ضرور ایسا کرتے۔ تجارتی سود کی نظیریں موجود تھیں۔ اس سود کے نفع و نقصان کے تمام پہلو سامنے آچکے تھے۔ سود کو حضورؐ اکرم نے حجۃ الوداع کے دن عملاً کالعدم قرار دیا۔ اس کے بعد آپؐ چار ماہ اس دنیا میں تشریف فرما رہے۔ اس دوران حضرت عمرؓ نے آپؐ کے رویہ میں سود کے بارے میں کوئی لچک نہیں دیکھی۔ بنابریں آپ نے اجتہاد کرنے کی بجائے دوسروں کو بھی ایسا اجتہاد کرنے سے روک دیا اور فتویٰ صادر فرما دیا کہ سود اور اس کی تمام مشتبہ صورتوں کو بھی چھوڑ دیا جائے۔

© rasailojaraid.com